Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

JOURNAL PROFILE
Noor-e-Tahqeeq is a quarterly, HEC "Y" Category research journal of Lahore Garrison University, publishing peer-reviewed studies in Urdu language and literature since 2017. It provides a credible platform for original research and contemporary criticism.

CONTACT
Dr Muhammad Haroon Qadir
Editor, Noor e Tahqeeq
Department of Urdu
Lahore Garrison University, Lahore, 0303-3330345

Email
lgunt@lgu.edu.pk

Website
https://ojs.lgu.edu.pk/nooretahqeeq

ISSUE DETAILS
Volume 9, No 03
July to September 2025
Page No: 1-14

DOI
https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2025.09032365

HISTORY OF THE PAPER
Received on: June 12, 2025
Accepted on: July 5, 2025
Published on: Aug 18, 2025

PUBLISHED BY
Department of Urdu,
Lahore Garrison University
DHA Phase 6, Sector C,
Avenue 4, Lahore

TITLE OF THE PAPER

Intizar Hussain and Creative experience of the past: In the Context of "Sheherzad Ke Naam"

انتظار حسین اور ماضی کا تخلیقی تجربہ: "شہرزاد کے نام" کے تناظر میں

AUTHOR(S)

- **Taskeen Fatima**
  BS Urdu Research Scholar,
  Kinnaird College for Women, Lahore
- **Dr Elizabeth Shad**
  Associate Professor, Department of Urdu
  Kinnaird College for Women, Lahore

ABSTRUCT

This research article critically examines Sheherzad Ke Naam, the last short story collection of Intizar Hussain, published in 2002, comprising seventeen short stories. The study explores how Hussain creatively reimagines the past through the lenses of nostalgia, symbolism, and storytelling traditions. It highlights the interplay of memory, myth, and socio-political commentary in his fiction, showing how past events, cultural heritage, and allegorical narratives intertwine with contemporary realities. The analysis focuses on selected stories such as Daira, Mornama, Sheherzad Ki Maut, Reserve Seat, Hum Nawala, Jabala Ka Putt, and others, illustrating how Hussain address's migration, cultural identity, environmental degradation, socio-political violence, and moral decline. By blending classical storytelling modes with modern issues, he creates a narrative space where the personal and collective past becomes a lens to interpret present-day crises. This article also underscores Hussain's mastery of symbolic expression, interwoven narratives, and cultural references, establishing Sheherzad Ke Naam as a significant work in Urdu short story tradition.

KEY WORDS

Intizar Hussain, *Sheherzad Ke Naam*, Urdu short story, nostalgia, symbolism, migration, environmental degradation, cultural identity, socio-political commentary, allegory, storytelling tradition.

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

انتظار حسین اور ماضی کا تخلیقی تجربہ: ''شہر زاد کے نام'' کے تناظر میں

انتظار حسین نے بیک وقت ناول نگاری، افسانہ نگاری، کالم نگاری اور صحافت کے ذریعے اُردو ادب میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ انھیں قومی اور بین الاقوامی سطحوں پہ سراہا گیا ہے۔ اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہونے کے ساتھ اپنے اسلوب اور بدلتے لہجوں کے باعث موجودہ دور کے افسانہ نگاروں کے سامنے انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کی اہمیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے داستانوی فضا، کردار نگاری اور اسلوب کو اپنے عصری تقاضوں کے تحت برتا ہے۔ ان کی تحریروں میں ماضی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں اساطیری رجحان، ناسٹیلجیا، کلاسیک سے محبت، ماضی پرستی اور روایت بہت نمایاں ہے۔ انتظار حسین علامتی اور استعاراتی اسلوب کے نئے نئے ڈھنگ استعمال کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔

انتظار حسین نے کئی افسانوی مجموعے تخلیق کیے ہیں جن میں سے ایک ''شہر زاد کے نام'' ہے جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں ان کے سترہ (۱۷) افسانے شامل ہیں۔ وہ تمام خصوصیات و موضوعات جو ان کے افسانوں کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں ماضی کی یاد، علامت نگاری، ماحولیاتی آلودگی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں اکثر ایک کہانی کے ساتھ ہی دوسری کہانی منسلک ہوتی ہے یعنی کہانی در کہانی سلسلہ چلتا ہے۔ ان افسانوں میں عمدہ اسلوب، محاورات، ضرب المثال، قدیم سے جدید دور کا تقابل اور اعلیٰ منظر نگاری پیش کی گئی ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں میں کہیں کہیں داستانوی فضا بھی پائی جاتی ہے یعنی وہ تمام خصوصیات جو انتظار حسین کو منفرد افسانہ نگار ثابت کرتی ہیں، اس مجموعے کا خاصا ہیں۔

افسانوی مجموعے شہر زاد کے نام میں پہلی کہانی ''دائرہ'' ہے۔ افسانوی خصوصیات کا نمائندہ یہ افسانہ شروع ہی ناسٹیلجیا یعنی ماضی کی یاد سے ہوتا ہے۔ اس میں انتظار حسین ماضی کے پچاس سالوں یعنی گزری ہوئی آدھی صدی کا ذکر کرتے ہیں۔ اس زمانے کے حالات و واقعات ایک خواب کی مانند معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے بے شمار چیزوں اور جگہوں کی منظر نگاری پیش کی ہے جیسے گرد میں لپٹی گلیاں، چہچہاتے پرندے، درخت، قیوما کی دکان اور دیگر کردار قابل ذکر ہیں۔ انتظار حسین اس کہانی میں چونکہ ماضی کے پچاس سالوں کا ذکر کر رہے ہیں اس لیے وہ اپنی پہلی کہانی قیوما کی دکان کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ انتظار حسین دراصل اپنی کہانی کے مرکزی کردار کو یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو کہ قیوما نہیں تھا کیونکہ وہ شخص نہ تو یہاں مستقل رہ سکا اور نہ ہی جا سکا، درمیان میں ہی اٹکا رہا۔ ہجرت کے بعد اگرچہ جسمانی طور پر وہ یہاں پر موجود نہ تھا مگر ذہنی طور پر وہ اب بھی وہاں ہی خود کو محسوس کرتا تھا۔ ہجرت کے دوران ایسے حالات سے بے شمار لوگوں کو گزرنا پڑتا ہے۔ انسان جس جگہ یا جس بستی میں رہ رہا ہوتا ہے وہ لاشعوری طور پر وہاں کے سماج اور معاشرت میں گھل جاتا ہے اور ان سب سے چھٹکارا آسانی نہیں پایا جا سکتا جیسا کہ اس افسانے میں انتظار حسین لکھتے ہیں:

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

"بستیاں خالی جغرافیہ نہیں ہوتیں اور محض، زمین پر آباد نہیں ہوتیں۔ آدھی زمین پر ہوتی ہیں،
آدھی دل و دماغ میں بسی ہوتی ہیں۔"(۱)

ہر انسان پر واقعات یا حالات ایک جیسا اثر نہیں کرتے۔ کچھ پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں جیسے اگر ہجرت کے حوالے سے ہی دیکھا جائے تو کچھ لوگ بہت جلد نئی جگہ سے مانوس ہو جاتے ہیں اور کچھ کو سالوں لگ جاتے ہیں۔ بظاہر جو بستیاں ہمیں عام سی معلوم ہوتی ہیں وہ دراصل اپنے اندر بے شمار واقعات کو سموئے ہوتی ہیں۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے وہاں کی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ وہ لوگ کس قدر مہمان نواز تھے۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کہانی کے ساتھ بھی انھوں چھوٹے چھوٹے قصے بیان کیے ہیں۔ اس میں رسم و رواج اور مذاہب کی بھی نمائندگی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور ساتھ ساتھ ہندوؤں کی مُردوں کو جلانے والی رسم کے متعلق بھی بتایا ہے۔ انھوں نے نہ صرف مختلف مذاہب کا ذکر کیا ہے بلکہ ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کا بھی ذکر کیا ہے جیسے انتظار حسین نے اسلام کے مختلف فرقوں شیعوں اور سنیوں کا ذکر کیا ہے۔

انتظار حسین کے آج سے کئی سال قبل لکھے گئے افسانے موجودہ دور کے حالات کی عکاسی کرتے ہیں جیسے موجودہ دور کی طرح اس وقت کے ماسٹر پیارے لال بھی انقلاب کے لیے کوشاں تھے اور گرفتار ہونے کے باوجود بھی وہ مہاتما گاندھی کی جے کے نعرے لگاتے رہے یعنی اپنے نظریات پر ڈٹے رہے۔ اس افسانے میں بھی ہلکی پھلکی داستانوی فضا محسوس کی جاسکتی ہے کیونکہ اس میں بھی مافوق الفطرت عناصر جیسے چڑیل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اپنے افسانوں میں ماضی کی یاد (ناسٹیلجیا) کے حوالے سے انتظار حسین لکھتے ہیں:

"میں افسانہ کیا لکھتا ہوں؟ کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتا ہوں اور آتش رفتہ کے سراغ کا سلسلہ
شروع ہو جائے تو سن ستاون تک محدود نہیں ہے۔ پہنچنے والا میدان کربلا بھی جا سکتا ہے اور اس
کے پیچھے جنگ بدر بھی جا سکتا ہے۔"(۲)

دراصل اس افسانے میں مصنف ایک خواب دیکھ رہا ہے اور وہ اپنی پرانی بستی میں پہنچ جاتا ہے لیکن وہاں پر اب کوئی بھی آدمی یعنی ماضی کا ساتھی نہیں ملتا ہے اور جب مصنف کربلا کے نزدیک پہنچتا ہے تو اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ ہجرت کے اتنے سال گزر جانے کے باوجود بھی انتظار حسین خود کو اپنی پرانی بستی میں ہی دیکھتے ہیں کیونکہ وہ جگہ مکمل طور پر ان کے شعور و لاشعور دونوں میں رچ بس چکی ہے۔ وہ جسمانی طور پر وہاں موجود نہیں لیکن ذہنی طور پر خود کو وہیں محسوس کرتے ہیں۔

انتظار حسین کا تخلیق کردہ افسانہ "مورنامہ" ماحولیاتی آلودگی کی نمائندگی کرتا ہے جیسا کہ جھیلیں جن میں پہلے صاف پانی ہوتا تھا اب وہ خشک ہو چکی ہیں، ندیوں میں صاف پانی کی جگہ گندے پانی نے لے لی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اگر ہم اپنے ارد گرد کے ماحول پر نگاہ دوڑائیں تو اس میں سب سے پہلے ہوا اور پانی ہے۔ بے شمار مضر گیسوں نے فضا کو آلودہ کر دیا ہے۔ اسی طرح انسان جب سے ترقی کی راہ پر

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

گامزن ہوا ہے اس نے صرف اس کے فوائد کو ہی مد نظر رکھا ہے جبکہ ہر چیز کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ یہ کہانی دراصل جنگوں اور نفرتوں کے خلاف لکھی گئی۔ خوفناک ہتھیار اور بم دھماکے تو صرف ڈرانے دھمکانے کے لیے بنائے گئے تھے اور سب لوگ ہی اس بات سے آگاہ تھے کہ ان کو چلانے سے صرف تباہی ہو گی۔ اس افسانے "مورنامہ" میں انتظار حسین نے ایٹمی طاقت کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستان نے راجھستان کے علاقے میں جب ایٹمی تجربہ کیا تو اس کی لپیٹ میں نہ صرف انسان آئے بلکہ ماحولیاتی آلودگی کے ساتھ ساتھ جانور اور پرندے بھی اس کی زد میں آئے۔ اس ایٹمی دھماکے سے قبل راجھستان میں مور کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے لیکن اس دھماکے کے بعد وہاں سے موروں کی نسل کا خاتمہ ہو گیا نہ صرف یہ بلکہ اس ماحولیاتی آلودگی نے آبی آلودگی میں بھی اضافہ کیا۔ جیسے پٹرول کی آلودگی اور فیکٹریوں سے نکلنے والے گندے اور زہریلے پانی نے آبی مخلوق کے ساتھ ساتھ فصلوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس سلسلے میں مرغابی کا ذکر کیا گیا ہے کہ پہلے وہ جس صاف پانی کو پی کر توانا محسوس کرتی تھی اب وہی پانی اس کے لیے زہر بن چکا ہے۔ اس حوالے سے افسانے میں لکھے گئے انتظار حسین کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

"جو پانی کل تک اس کے لیے امرت کا مرتبہ رکھتا تھا آج زہر بن۔" (۳)

انسان جس ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر خوش ہو رہا ہے وہ اس کے فوائد تو دیکھ رہا ہے لیکن نقصانات کو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس ترقی کی خاطر اس نے انسانوں، جانوروں اور پرندوں پر تجربات کیے ہیں۔ کوئی بھی تجربہ ہو سب سے زیادہ نچلے طبقے کے لوگ ہی پستے ہیں کیونکہ ان کے پاس وسائل کم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر موجودہ دور میں مہنگائی بھی سب سے زیادہ نچلے طبقے کے لوگوں کو متاثر کر رہی ہے یعنی سختیاں کمزور لوگوں کو ہی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ کہ ان کے پاس وسائل کم ہوتے ہیں۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے بہت خوب منظر کشی کی ہے جس کی مثال درج ذیل ہے:

> "جب دن ڈھلے میں نے اس دلہن جیسے سجائے ریسٹ ہاؤس میں اپن کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے پھیلے ہوئے صحن میں فوارے کے ارد گرد چبوترے پر منڈیروں پر مور ہی مور، کتنے سکون کے ساتھ اور کتنی خاموشی سے اپنی چمکیلی لمبی دنوں کے ساتھ ایک شاہانہ وقار کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے۔" (۴)

انتظار حسین افسانے میں ایک کہانی کو بیان کرتے ہوئے دوسری کہانی کو بھی شروع کر دیتے ہیں جیسے راجھستان کے موروں کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں مور جنت کا جانور ہے اور اس کو غلطی کی سزا کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے کیونکہ مور نے شیطان کو ایک بزرگ کے حلیے میں دیکھا اور اس پر ترس کھاتے ہوئے جنت کا دروازہ کھول دیا۔ اس غلطی کی سزا بھگتنے کے لیے مور کو جنت سے نکال کر اس دنیا میں بھیج دیا گیا۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

انتظار حسین کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں ضرب المثال کا بھی استعمال کیا ہے جیسا کہ اس افسانے میں جب مور، شیطان کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے اور شیطان خوشی خوشی اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر انتظار حسین نے درج ذیل ضرب المثل استعمال کی ہے؛ "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔"

کلاسیک ادیب کی تحریروں میں یہ وصف بھی پایا جاتا ہے کہ کہانی چاہے ماضی کی ہو یا حال کی وہ ہر زمانے میں تازگی کا احساس دیتی ہے اور ہر دور کی نمائندگی کرتی ہے۔ انھوں نے اگرچے یہ افسانہ آج سے کئی سال قبل لکھا لیکن اگر موجودہ دور کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہ مسائل آج بھی موجود ہیں۔ جیسے اس افسانے کے آغاز میں انتظار حسین لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے ایٹمی دھماکے کی خبروں کو پڑھ کر فوراً ایک کالم لکھ دیا۔ اگر اس بات کو موجودہ دور میں بھی دیکھا جائے تو اکثر لکھنے والے صرف آدھی ادھوری بات جان کر ہی اپنا تبصرہ پیش کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ اس طرح سے بعض اوقات خاص بات کو بھی اہمیت نہیں دی جاتی ہے اور بعض اوقات عام بات کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔

انتظار حسین کا یہ افسانہ علامتی اور ماحولیاتی آلودگی کے عنصر میں لکھا گیا ہے۔ اس ماحولیاتی افسانے کے ذریعے انھوں نے درحقیقت ہندوستان کے لوگوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو ایک دوسرے کے مخالف ہو چکے تھے۔ المختصر اس افسانے میں مصنف نے ماحولیاتی آلودگی کے ساتھ ساتھ عمدہ اسلوب اپناتے ہوئے دلکش منظر نگاری بھی پیش کی ہے۔ ان کے فن کی ایک خاص جہت داستانوی انداز ہے۔ داستانوی فضا کی بھرپور عکاسی افسانہ "شہر زاد کی موت" میں نمایاں کی گئی ہے۔ یہ افسانہ درحقیقت داستان الف لیلہ داستان میں موجود کہانی کا ایک پہلو ہے۔ ایک لڑکی جس کا نام شہر زاد ہے اور وہ سمرقند کے وزیر کی بیٹی ہے، اس کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ بادشاہ شہریار جو کہ اپنی ملکہ کی بے وفائی کی وجہ سے ہر رات ایک لڑکی سے شادی کرتا اور صبح ہوتے ہی اس کا سر قلم کر دیتا تھا۔ ان حالات میں شہر زاد اس بادشاہ سے شادی کرتی ہے۔ شہر زاد ہر رات بادشاہ کو کہانی سناتی ہے لیکن جیسے ہی صبح ہوتی ہے وہ کہانی سنانا چھوڑ دیتی ہے۔ پھر باقی کہانی رات کو سنانے کا وعدہ کرتی ہے۔ اسی طرح ایک ہزار ایک راتیں گزر جاتی ہیں۔ اس عمل سے شہر زاد نہ صرف اپنی جان بچاتی ہے بلکہ اپنے ساتھ ساتھ اور بھی کئی کنواری لڑکیوں کو بادشاہ کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا لیتی ہے۔ ان راتوں کو کالی ڈراؤنی راتوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ انسان جب کچھ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیتا ہے تو وہ ہر صورت کامیاب ہوتا ہے۔

اس کے بعد شہر زاد کی جان بخشی ہو گئی اور اس نے کہانیاں کہنا چھوڑ دیں لیکن اپنے حافظے پر حیران ہوئی تھی کہ اتنی زیادہ کہانیاں اسے یاد کیسے تھیں۔ اب تو اسے ان کہانیوں میں سے کوئی بھی مکمل یاد نہ تھی۔ شاید اس وقت تو صرف موت کے خوف کی وجہ سے کوئی نہ کوئی کہانی اس کے ذہن میں آتی جا رہی تھی۔ اس ضمن میں افسانے کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں:

> "مجھے کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا، بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کہانی کہنی ہے اور زندہ رہنا ہے۔ پھر کہانیوں میں میں ایسی کھو گئی کہ زندہ رہنے کا خیال بھی پیچھے چلا گیا۔" (۵)

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

درحقیقت موت کا خوف انسانی المیہ ہے اور اس خوف سے وہ کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ جب کہانیاں انجام تک پہنچیں تو بادشاہ کی کایا ہی پلٹ گئی۔ اس نے اپنے گناہوں سے توبہ کرلی لیکن جب شہرزاد نے کہانیاں سنانا چھوڑ دیں تو وہ پریشان رہنے لگی کیونکہ وہ کہانیاں ہی اس کا اصل سرمایہ تھیں۔ جب کسی تخلیق کار سے اس کی تخلیقی قوت ہی چھین لی جائے تو اس تخلیق کار یا فنکار کا زندہ رہنا یا نہ رہنا برابر ہوتا ہے کیونکہ اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو چکا ہوتا ہے۔ جان بخشی ہو جانے کے بعد شہرزاد اپنے حال اور ماضی کی راتوں کا موازنہ کچھ اس طرح کرتی ہے:

"ہر رات یوں لگتا کہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے مگر اب اسے ہر رات یوں دکھائی دے رہی
تھی کہ وہی اس کی زندگی کا حاصل تھی۔"(۶)

اس افسانے میں انتظار حسین نے شہرزاد کو مثال بنا کر یہ کہا ہے کہ ہر انسان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر کسی میں کوئی نہ کوئی تخلیقی قوت ضرور موجود ہوتی ہے لیکن جب کوئی فنکار یا تخلیق کار اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چھوڑ دیتا ہے تو پھر اس کے زندہ ہونے یا نہ ہونے میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا ہے۔ انتظار حسین کے اس افسانے میں داستانوی فضا دکھائی دیتی ہے کیونکہ داستانوں میں ہی طویل ہزاروں راتوں پر مشتمل کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ انتظار حسین نے مافوق الفطرت عناصر کا ذکر بھی کیا ہے۔

انتظار حسین کے افسانے "ریزروسیٹ" میں عجیب نوعیت کے خوابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بوجی جو کہ گھر کی بزرگ خاتون ہیں۔ ان کو اکثر خوفناک قسم کے خواب آتے ہیں جس میں وہ اپنے آباؤاجداد اور بے شمار ایسے لوگوں کو دیکھتی ہیں جو مر چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں جن کو بوجی نے حقیقت میں زندہ کبھی نہیں دیکھا ہوتا ہے۔ بوجی ان خوابوں سے پریشان ہو جاتی ہیں اور قیاس کرتی ہیں کہ اب ان کا بھی وقت آنے والا ہے۔ اسی خوف اور قیاس کے پیشِ نظر وہ اپنی موت سے قبل اپنے بیٹے مرتضیٰ اور پوتے ارتضیٰ سے ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ انھیں خط لکھ کر بلایا گیا۔ بوجی کافی عرصے سے ان دونوں سے نہیں ملی تھیں۔ اب بے صبری سے انتظار کرنے لگیں۔ آخر کار وہ دونوں آ گئے۔ ان کو دیکھنے کے بعد بوجی ایک دم تندرست ہو گئیں۔ ایک روز جب ارتضیٰ فجر کی نماز مسجد میں ادا کر رہا تھا تو اچانک سے شور برپا ہوا۔ ہر کوئی پریشان ہو گیا۔ اتنی دیر میں محلے کے لوگ ارتضیٰ کو خون میں لت پت اٹھا کر گھر لائے اور وہ کچھ ہی لمحوں میں دم توڑ گیا۔

معلوم ہوا کہ دہشت گردوں نے مسجد میں گھس کر کلاشنکوفیں چلائیں اور لوگوں کے سر تن سے جدا کر دیے۔ یہ افسانہ ارتضیٰ کی موت پر ختم نہیں ہوتا۔ درحقیقت کہانی کا یہاں سے آغاز ہوتا ہے۔ اس افسانے میں کلاشنکوف کلچر کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس طرح سے انتہاپسندی نے معاشرے میں ترقی حاصل کی اسی طرح کلاشنکوف کلچر بھی بہت زیادہ پھلا پھولا۔

انتظار حسین نے اس کہانی کے ذریعے حالات کی سنگینی پر تبصرہ کیا ہے جس میں مصنف نے معاشرتی اور معاشی حالات کی عکاسی کی ہے۔ ان حالات میں فرقہ وارانہ فسادات، قتل وغارت، کلاشنکوف کلچر، مقدس جگہوں کی بے حرمتی شامل ہیں۔ مسجد عبادت کے ساتھ ساتھ امن وسلامتی کی جگہ ہے لیکن دہشت گردوں نے حملے ہی ایسی جگہوں پر کیے جہاں لوگ زیادہ تعداد میں موجود ہوتے ہیں جیسے مسجد، سکول، مدرسے وغیرہ۔ اس افسانے میں موجود خصوصیات کو دیکھا جائے تو اس میں ماضی کی یاد کی عکاسی بوجی کے خواب کے ذریعے کی گئی ہے اور

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

موجودہ حالات کی عکاسی اس طرح ہے کہ اگر اس افسانے کا مقابلہ دور حاضر کے حالات سے کیا جائے تو آئے روز کہیں نہ کہیں بم دھماکے یا گولیاں لگنے کی وجہ سے ان گنت بے قصور لوگوں کی جانیں چلی جاتی ہیں۔ اگرچہ انسان نے اپنے دفاع کے لیے بہت زیادہ ایٹمی طاقت حاصل کر لی ہے لیکن وہ اسکو بنانے کا مقصد بھول چکا ہے کہ اس کا مقصد ملک و قوم کا تحفظ ہے لیکن آہستہ آہستہ لوگ اس اصل مقصد کو بھول گئے اور پھر بجائے ایک دوسرے کے تحفظ کے ہم نے آپس میں ہی لڑنا، جھگڑنا اور انتشار پھیلانا شروع کر دیا۔

انتظار حسین کا تحریر کردہ افسانہ "ہم نوالہ" بنیادی طور پر پرندوں کے متعلق لکھا گیا ہے اور اس کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ پرندے اور انسان اپنے سے وابستہ تعلقات سے کس قدر مانوس ہو جاتے ہیں اور اس بات کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان کو کھو دیتے ہیں۔ اس افسانے میں ایک شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو دن بھر کا تھکا ہارا جب رات کو گھر لوٹتا ہے تو اس کے کمرے میں پہلے سے کھانا اس کی ماں رکھ دیتی ہے۔ جیسے ہی وہ کھانا شروع کرتا ہے کمرے میں سے چڑیا کی آواز آنا شروع ہو جاتی ہے لیکن ان کے متعلق اسے معلوم تب ہوتا ہے جب وہ کھانا کھانے کے بعد غسل خانے سے کلی کر کے لوٹتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک چڑیا اور چڑا میز پر بیٹھ کر روٹی کے بچے ہوئے ٹکڑے کو کھا رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ اب تو وہ کھانا ختم ہونے کا بھی انتظار نہ کرتے تھے بلکہ ساتھ کھانے کے لیے آجاتے تھے۔ ایک رات موسم خراب تھا جب وہ واپس اپنے کمرے میں آیا تو وہاں پر چڑیا اور چڑے کو موجود نہ پا کر کافی پریشان ہوا۔ اب اس کو ان دونوں کے ساتھ کھانا کھانے کی عادت ہو چکی تھی۔ چڑیا اور چڑے کے چلے جانے کے بعد وہ رات کا کھانا گھر پر کھانے کا بھی پابند نہ رہا۔

اس کہانی میں انتظار حسین نے اور بھی پرندوں کا ذکر کیا ہے جس میں طوطا اور کبوتر شامل ہیں۔ ایک روز جب طوطے سے قبل کبوتروں کو کھانا ڈال دیا گیا تو طوطا اس بات پر ناراض ہو گیا کیونکہ طوطے کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی کہ اس کے مقابلے میں کبوتروں کو فوقیت دی گئی۔ یہ بھی انسانی سرشت ہے کہ انسان محبت میں شراکت پسند نہیں کرتا۔ یہ بات انتظار حسین نے ان پرندوں کے ذریعے بیان کی ہے۔ اس افسانے کے ذریعے انتظار حسین انسانوں کی غلط عادات کو بھی پرندوں کے ذریعے نمایاں کرتے ہیں جیسے کہ انتظار حسین نے اس افسانے میں لکھا ہے:

> "طوطوں میں بہت خوبیاں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑا عیب یہ ہے کہ صحبت کا اثر بہت جلد ہوتا ہے۔" (۷)

یہ حقیقت ہے کہ طوطوں نے انسانوں کی صحبت میں رہ کر نہ صرف باتیں کرنا سیکھا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کی کئی بری عادات کو بھی اپنایا ہے۔ طوطوں نے انسانوں سے جو عیب سیکھے ہیں ان میں حسد، کینہ اور غصہ ہے جبکہ اس کے برعکس اگر کبوتروں کا ذکر کیا جائے تو ایک طویل مدت تک انسانوں کی صحبت میں رہنے کے باوجود بھی ان میں ایسے عیب نہیں پائے جاتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صوفیاء کی صحبت میں رہے ہیں۔ مختصراً اس افسانے میں انتظار حسین نے پرندوں کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے انسانوں کے

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

عیب بیان کیے ہیں اور دوسرا عنصر یہ بتایا ہے کہ ہم انسان جلد ہی چیزوں سے مانوس ہو جاتے ہیں لیکن ہم ان کی قدر نہیں کر پاتے ہیں۔ اس انسیت کا احساس ہمیں ان رشتوں یا تعلقات کو کھو دینے کے بعد ہوتا ہے۔

"جبالا کا پوت" گہرے تہذیبی شعور و روایت کے ضمن میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ اس میں ہندوستانی تہذیب کی نمائندگی کی گئی ہے۔ افسانے میں ہندی زبان کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ کہانی کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ جبالا ایک بچے کی ماں ہے اور اس کے بیٹے کو سوال کرنے کی بہت عادت ہے یا یہ کہ سکتے ہیں سوال کرنا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ ایک روز جبالا کا پوت اس کے کہنے پر لومارشی کے پاس گیان حاصل کرنے کے لیے جاتا ہے تو لومارشی اس سے باپ کا نام پوچھتا ہے جو کہ اسے معلوم نہیں ہوتا ہے۔ بیٹا ماں کے پاس واپس جاتا ہے اور اپنے باپ کا نام پوچھتا ہے لیکن اس کی ماں اسے کہتی ہے کہ تیری پہچان یہ ہے کہ تو جبالا کا پوت ہے کیونکہ یہ ان دنوں کی بات تھی جب میں راج محل میں دھوبن تھی، اس دوران بے شمار مردوں سے ملی تھی۔ بس مجھے معلوم نہیں کہ تو ان میں سے کس کا بویا ہوا بیج ہے۔

اس افسانے کے ذریعے انتظار حسین نے عورت کی مظلومیت اور مرد کی استحصالی طبیعت کا کڑوا سچ بیان کیا ہے۔ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ اولاد کو باپ کے نام سے ہی پہچانا جاتا ہے لیکن انتظار حسین نہایت خوبصورت الفاظ میں عورت کو بھی وہی مقام دیتے ہیں جو مرد کا ہے۔ جیسا کہ اس افسانے کے چند جملے ملاحظہ فرمایئے:

> "مگر میرے پوت، تو کان کھول کے سن لے اور جان لے کہ کونپل مٹی سے پھوٹتی ہے اور پیڑ، پودے اپنی دھرتی ہی سے پہچانے جاتے ہیں، بیج ڈالنے والے سے نہیں۔"(۸)

رشی اس بچے کو اپنی سرپرستی میں اس شرط پر لیتا ہے کہ وہ بارہ سال تک بھوربن میں گیوں اور دوسرے مویشیوں کی دیکھ بھال کرے گا۔ جبالا کا پوت اس شرط کو مان لیتا ہے۔ بارہ سالوں کے اختتام پر ہر جانور گائے، بیل اور ناگ وغیرہ ہر رات ایک ایک کر کے اس کو خاموشی کے ساتھ تمام بھیدوں سے آگاہ کرتے ہیں اور جب جبالا کا پوت بھوربن سے واپس لومارشی کے پاس جاتا ہے تو وہ جو بھی بیان اسے دینے لگتا ہے جبالا کا پوت کہتا ہے کہ یہ سب باتیں میں جانوروں سے سیکھ آیا ہوں۔ اس افسانے کے ذریعے انتظار حسین درحقیقت انسانوں پر طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ انسان اب اس قابل نہیں رہا ہے کہ وہ گیان دے سکے کیونکہ موجودہ دور کا انسان فطرت سے ناطہ توڑ چکا ہے اور مادیت پسند ہو گیا ہے۔ اس مادیت پسندی اور ترقی کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک جائز یا ناجائز کچھ بھی نہیں رہا، وہ بس ترقی کرنا چاہتا ہے اور اس کی خاطر وہ لڑنے مرنے کو بھی تیار ہے۔ انسان کو ان سب باتوں سے ہی فرصت نہیں تو وہ کسی کو گیان کیا دے گا۔ افسانے کے آخر میں جبالا کا پوت موجودہ دور کے انسان کی حقیقت درج ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> "آدمی تو مورکھ ہے اسے اپنے چھل کپٹ، اپنے لڑنے مرنے ہی سے فرصت نہیں۔ اس کیا گیان ملے اور وہ کسی کو کیا گیان دے گا۔"(۹)

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

جبالا کا پوت آخر میں پھر جانوروں کے ساتھ جا کر رہنا شروع کر دیتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک موجودہ دور کے انسانوں سے بہتر تو جانور ہی ہیں۔ انتظار حسین کی فنکارانہ عظمت کا منہ بولتا ثبوت ان کی کردار نگاری ہے۔ وہ کرداروں کے انتخاب نہایت دانشمندی سے کرتے ہیں۔ "جبالا کا پوت" میں جبالا کے پوت کا کردار، لومارشی کا کردار اس طرح جبالا کا کردار اپنی نوعیت کے بہترین کردار ہیں۔ جبالا کے پوت کی معصومیت سارے افسانے کی فضا کو دلچسپ بنا دیتی ہے۔ لومارشی اپنی ذہانت اور گیان کو عمدہ طریقے سے الفاظ میں ڈھالتا ہے۔ ان کرداروں کے درمیان مکالمہ نگاری بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کی گئی ہے، ملاحظہ فرمایئے:

"لومارشی نے اسے غور سے دیکھا۔ پوچھا۔ "پتر تو یاں کیا لینے آیا ہے۔"
جبالا کے پوت نے ہاتھ جوڑ کے کہا: "مہاراج گیان کی مایا۔"
بولے۔ "گیان کی مایا مانگے سے نہیں ملا کرتی۔"(۱۰)

اس افسانے میں انتظار حسین نے گیان حاصل کرنے کے لیے فطرت سے منسلک ہونا لازمی قرار دیا ہے کیونکہ جو سبق انسان فطرت اور جانوروں سے حاصل کر سکتا ہے، وہ انسانوں یا کسی کتاب سے حاصل کرنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "کلیلہ نے دمنہ سے کیا کہا" بنیادی طور پر دو گیدڑوں کے مابین مکالمہ ہے جس میں وہ حالات حاضرہ پر بحث کر رہے ہیں۔ اس کہانی میں ایک کے بیل روپ بدلنے کے متعلق جب بات ہوتی ہے تو کلیلہ کہتا ہے کہ بیل تو مار دیا جائے گا، اس کے جواب میں دمنہ کہتا ہے کہ سیاست میں اکثر لوگوں کو مروا دیا جاتا ہے۔ سیاست میں تو نسلوں کو تباہ کر دیا جاتا ہے اور پچھتاوا بھی نہیں ہوتا مروانے والوں کو۔ ایک گیدڑ کہتا ہے کہ جو کچھ مرضی کر لیا جائے کوئی بھی اپنی اصل شناخت کو چھپا نہیں سکتا ہے جبکہ دوسرا بضد ہے کہ بہت کم ذاتوں نے اپنی جعلی شناخت سے بلند مقام حاصل کیا ہے۔ اس افسانے میں اور بھی ایسے قصے بیان کیے گئے ہیں جن میں اصل شناخت کی بجائے نقل کو فوقیت دی گئی ہے۔ انتظار حسین نے اپنی کہانیوں میں علامت نگاری کو بڑے وسیع پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ اس کی ایک بہترین مثال "کلیلہ نے دمنہ سے کیا کہا" بھی ہے۔ ان کے افسانوں میں علامت کے حوالے سے محمد عاصم بٹ لکھتے ہیں:

"انتظار حسین کے افسانوی مجموعوں میں موجود افسانوں کے بیش تر عنوانات علامتوں پر مبنی ہیں۔ ("شہر زاد کے نام") میں دائرہ، مور نامہ، کلیلہ نے دمنہ سے کیا کہا، دمنہ کیوں ہنسا، کلیلہ کیوں رویا، شہر زاد کے نام جیسے افسانوں میں انھوں نے علامتوں کو جس انداز میں برتا ہے اس نے انتظار حسین کو اردو جہان ادب کا دیومالائی روپ بخش دیا ہے ایک متحیر علامتی فضا ہے جو قاری کے لیے حیرتوں کے در کھولتی چلی جاتی ہے۔"(۱۱)

اس افسانے میں انتظار حسین نے جانوروں کے ذریعے سے انسانوں کی خامیوں اور جھوٹی شناخت پر طنز کیا ہے کہ کس طرح انسان سازشیں کرتے ہیں اور سیاست میں ایک دوسرے کا مقام حاصل کرنے کے لیے غلط راستے اختیار کرتے ہیں۔ اسی لیے حکومتی سطح سے لے کر

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

انفرادی سطح تک اناڑی پن کا راج ہے۔ لوگوں نے اس محاورے "جس کا کام اسی کو ساجھے" سے الٹ کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر موجودہ دور کی مثال لی جائے تو اساتذہ اب علم دینے کی بجائے اپنی اکیڈمیوں کو فیکٹریاں یہ سمجھ کر چلا رہے ہیں۔ محافظ لوٹ مار کرنے میں لگے ہیں۔ اس حوالے سے افسانے میں انتظار حسین کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

"گیدڑ لاکھ رنگ بدلے گیدڑ ہی رہے گا اور جس کی جو اصل ہے اسے لاکھ چھپاؤ وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے۔" (۱۲)

اس افسانے کے اختتام پر کلیلہ گیدڑوں کی حالت پر رحم کی دعا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نئی تہذیب نے انھیں پاگل بنا دیا ہے۔ جس وجہ سے انھیں اپنے کلچر میں برائیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ دراصل ان جملوں کے ذریعے انتظار حسین موجودہ دور کے انسانوں پر طنز کر رہے ہیں کہ انھیں اپنی تہذیب پسند نہیں ہے اور دوسروں کے کلچر پر مرمٹنے کے لیے تیار ہیں۔ چاہے اس میں جتنی مرضی خامیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ بس ہر کوئی اپنی اصل سے بھاگ رہا ہے اور بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے کہ آخر کوئی کب تک اپنی اصل شناخت کو چھپا سکتا ہے۔

افسانے "مہابن کے بندروں کا قصہ" میں انتظار حسین نے مہابن جو کہ بھارت کا ایک علاقہ ہے وہاں کے بندروں کی عبرت بھری کہانی پیش کی ہے۔ پہلے تو یہاں پر کثیر تعداد میں بندر پائے جاتے تھے لیکن آہستہ آہستہ وہاں انسان آباد ہو گئے۔ بندر پہلے تو خود محنت کر کے جنگل اور لوگوں کی فصلوں سے اپنے لیے خوراک اکٹھی کرتے تھے لیکن ایک روز ایک دہقان ان بندروں سے تنگ آ گیا کیونکہ یہ اس کی فصل خراب کر دیتے تھے۔ اس نے ان کو چنے اور گڑ ڈالنا شروع کر دیا۔ پھر کیا تھا بندروں نے بھی محنت کرنا چھوڑ دی اور بیٹھ کر کھانے کے عادی ہو گئے۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے بندروں کے حوالے سے کئی چھوٹے چھوٹے قصے بیان کیے ہیں۔ جن کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح سے بندروں اور انسانوں کی کافی عادات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس افسانے میں جانوروں کو انسانوں سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ جب کچھ بندروں نے بہکی بہکی باتیں کرنا شروع کیں تو دوسرے بندروں نے انھیں دیکھ کر کہا کہ تم تو بالکل آدمیوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ انسان ہو یا جانور جب بیٹھ کر کھانے کا عادی ہو جاتا ہے تو محنت کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ یہی حال بندروں کا بھی ہوا۔ انھوں نے محنت کر کے کھانے کے مقابلے میں بیٹھ کر کھانے کو ترجیح دی۔

اسی طرح اس افسانے میں جان عالم بندر کا ذکر کیا گیا ہے جس کے متعلق قیاس آرائیاں ہیں کہ پہلے وہ بندر تھا پھر انسان بنا لیکن بعض کا خیال ہے کہ پہلے وہ انسان تھا پھر بندر بنا۔ انسان اور بندر دونوں میں ہی کافی زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس افسانے میں "اہل قلم بندر" کا قصہ بھی بیان کیا گیا ہے جس نے آدمی کی صحبت میں رہ کر لکھنا شروع کر دیا لیکن جب اس کے مالک کو اس بات کا علم ہوا تو وہ اس سے حسد کرنے لگا۔ اس کے ذریعے انسان میں موجود خامیوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ انسان کبھی بھی خود سے زیادہ کسی کے پاس کوئی چیز دیکھے گا تو وہ حسد کرے گا چاہے وہ علم ہو، دولت ہو یا شہرت۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے بندروں کے انسانی روپ میں آنے کو محض علامت کے طور پر

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

استعمال کیا ہے۔ اصل میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ظاہر تو انسانیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں لیکن اگر ان کی قلبی حالت کو دیکھا جائے تو وہ کافی حد تک جانوروں سے ملتی جلتی ہے۔

افسانے "میرے اور کہانی کے بیچ" میں انتظار حسین قدرے کھل کر اپنے دور کے حالات کو بیان کر رہے ہیں جس میں وہ ماحولیاتی آلودگی کے تمام عوامل کو بیان کرتے ہیں۔ جس میں درختوں کی کٹائی، پرندوں کی تعداد میں کمی وغیرہ شامل ہیں کیونکہ جب درخت کٹ جائیں گے تو وہ پرندے جنھوں نے ان درختوں پر قیام کیا وہ دربدر کی ٹھوکریں کھائیں گے۔ اس ضمن میں مصنف نے کوئل کی مثال دی ہے جس کی کوک پہلے کافی زیادہ سنائی دیتی تھی لیکن جب درخت ہی نہ رہے تو پرندے کیسے موجود رہتے۔ اس افسانے میں انتظار حسین ایٹمی توانائی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس ایٹمی توانائی کے حصول سے ہندوستانی اور پاکستانی دونوں ہی خوش ہیں جبکہ وہ اس کے منفی اثرات سے آگاہ نہیں ہیں۔ اس کے متعلق بڑی طاقتیں فکر مند ہیں کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ اب لوگ اس توانائی کا بے دریغ استعمال کریں گے۔ انتظار حسین نے اپنے عہد کی عکاسی اس افسانے کے ایک جملے میں بھرپور انداز میں کی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"ہمارا زمانہ بھی ایک دیو کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کا دیو۔"(۱۳)

انتظار حسین کہتے ہیں جب کوئی درخت کاٹا جاتا ہے تو یہ قتل کی واردات سے کم نہیں ہوتا کیونکہ درختوں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک سے پرندوں کا خاتمہ بھی ہو رہا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی بڑھتی جا رہی ہے۔ درخت جن سے ہمیں آکسیجن ملتی تھی اب ان کو اور جنگلات کو کاٹ کاٹ کر ہم نے ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنانا شروع کر دی ہیں۔ اس ماحولیاتی آلودگی نے انسانوں اور پرندوں دونوں ہی کو متاثر کیا ہے۔ اس حوالے سے انتظار حسین نے افسانے میں ناصر کاظمی ایک شعر پیش کیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

اڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کر طیور
اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے

انتظار حسین کہتے ہیں کہ انسان بم دھماکے کو اپنی ترقی کا راز سمجھتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہیروشیما کے حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ اسی کے ساتھ ساتھ چاغی کے پہاڑوں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ اس افسانے میں مصنف نے بم دھماکوں اور ماحولیاتی آلودگی کے نقصانات کو قلمبند کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترقی کس طرح سے متاثر کر رہی ہے۔ داستانوی انداز کا عکس اس افسانے میں بھی موجود ہے جیسا کہ اس افسانے میں انتظار حسین نے لکھا ہے:

"مجھے ان دنوں کتنی کہانیاں یاد آ رہی ہیں جو کہ میں نے بچپن میں اپنی نانی اماں سے سنی تھیں۔ ایک کہانی اس طرح تھی کہ ایک شہزادہ قسمت کا مارا ایک دیو کے چنگل میں پھنس گیا۔ اس دیو کا اپنا ایک عالیشان قلعہ تھا۔ شہزادے کو لے جا کر اس قلعے میں چھوڑ دیا اور ہدایت کی کہ اس قلعہ کے اندر تو ہر طرح آزاد ہے۔"(۱۴)

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

اس افسانے میں بھی انتظار حسین ماضی کی یاد سے پیچھا نہیں چھڑا پائے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس مختصر افسانے میں بھی کئی چھوٹے چھوٹے قصے بیان کیے ہیں۔ انتظار حسین کی یہ خوبی ہے کہ وہ ایک کہانی کو بیان کرتے ہوئے اس میں مزید چھوٹی چھوٹی کہانیاں بیان کر دیتے ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کے عنوان سے منسوب کہانی "شہر زاد کے نام" میں انتظار حسین اپنے زمانے کو ایک لمبی اور تاریک رات سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس کہانی کو شہر زاد کی کہانیوں سے منسوب کرتے ہیں۔ جس طرح شہر زاد کے پاس اپنی اور دیگر لڑکیوں کی جان بچانے کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ کہانی بیان کرتی رہے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جیسے ہی کہانی ختم ہوئی اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اسی طرح مصنف کہتا ہے کہ تاریک رات کو اجالے میں تبدیل کرنا میرے بس کا کام نہیں۔ میں تو صرف اس تاریک رات کو گزارنے کے لیے کہانی ہی کہہ سکتا ہوں۔ اس میں موجودہ دور کے انسان کی بے بسی دکھائی گئی ہے۔

در حقیقت انتظار حسین اپنے ارد گرد کے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لوگوں کو دھڑا دھڑ قتل کیا جا رہا ہے اور ہجوم والی جگہوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا جن میں بسوں کے اڈے، مساجد اور امام بارگاہ وغیرہ شامل ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ شہر زاد کی کہانی کو سننے کے لیے تو پھر بھی بادشاہ اور دنیازاد موجود تھے لیکن میری تو کہانی سننے والا بھی کوئی نہیں ہے لیکن پھر بھی پر امید ہیں کہ شاید میری تحریر کردہ کہانی اثر دکھائے۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے کئی مقامات کے متعلق بتایا ہے جنھوں نے ایٹمی طاقت کی بدولت نقصان اٹھایا۔ اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ قوم پرستی، نسل پرستی اور مذہب کا سہارا لیتے ہوئے اب تشدد کے نئے نئے ذرائع منسوب کر دیے گئے ہیں جیسے دہشت گرد مساجد میں جا کر نمازیوں پر گولیاں برساتے ہیں اور بعد میں کہتے ہیں کہ یہ مسلمان نہیں ہیں بلکہ کافر ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ اسلام کے نام پر دہشت گردی کرتے ہیں۔ انتظار حسین کہتے ہیں کہ ایسے حالات میں، میں تو صرف کہانی ہی لکھ سکتا ہوں، کیونکہ انسان بے بس ہے۔

تخلیق کار جتنا مرضی چاہے کہ اس کی تحریروں میں اس کے عہد کے مسائل واضح نہ ہوں یا وہ ان کے متعلق نہ لکھے لیکن پھر بھی شعوری یا لاشعوری طور پر ہر تخلیق کار اپنے عہد کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس کی تحریروں کو پڑھ کر اس دور کے مسائل کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اس افسانے کے چند جملے ملاحظہ فرمائیے:

> "آپ لاکھ اپنے زمانے سے بھاگیں زمانہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ پردوں میں چھپ کر بھی کہانی لکھیں گے تو زمانے کے انگارے وہاں پہنچ کر کہانی کو آنچ دیں گے۔"(۱۵)

اس افسانے میں انتظار حسین نے عمدہ اسلوب اپنایا ہے۔ جدید دور کے انسانوں کو نئے وحشیوں کے نام سے پکارا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان جتنی بھی ترقی کر لے اس کے اندر کا وحشی ختم نہیں ہو سکتا ہے اور کسی نہ کسی صورت ہر دور میں انسان کا بھیانک روپ سامنے آتا ہے۔ اس مجموعے میں انتظار حسین نے اردو زبان کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ ضرب الامثال کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے ماضی کی یاد کے ساتھ ساتھ معاشرے میں موجود مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

انتظار حسین کے دیگر افسانوی مجموعوں کے مقابلے میں اس مجموعے کا اسلوب پختہ ہے۔ اس میں شامل تمام افسانوں میں عمدہ منظر کشی کی گئی ہے۔ جو افسانے انھوں نے اپنے تخلیقی دور کے آغاز میں لکھے "شہر زاد کے نام" کے افسانوں میں ان کہانیوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ پہلے دور کے افسانوں اور شہر زاد میں موجود افسانوں میں گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ اس مجموعے میں اسلوب، منظر کشی، منظر نگاری اور کردار نگاری عمدہ کی گئی ہے۔ ان تمام خصوصیات کی بناء پر "شہر زاد کے نام" دیگر مجموعوں سے منفرد ہے۔ یہ مجموعہ افسانہ نگاری کے تمام فنی اور فکری محاسن پر پورا اترا ہے۔ اسی لیے یہ کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انتظار حسین، شہر زاد کے نام، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۲ء، ص:۹

۲۔ ایضاً، ص:۲۷

۳۔ نعیم انیس، ڈاکٹر، انتظار حسین: حیات و فن، کلکتہ: مغربی بنگال اردو اکیڈمی، ۲۰۱۷ء، ص:۳۶۰

۴۔ انتظار حسین، شہر زاد کے نام، ص:۲۸

۵۔ ایضاً، ص:۴۰

۶۔ ایضاً، ص:۴۴

۷۔ ایضاً، ص:۷۱

۸۔ ایضاً، ص:۹۸

۹۔ ایضاً، ص:۱۰۳

۱۰۔ ایضاً، ص:۹۷

۱۱۔ محمد عاصم بٹ، انتظار حسین تنقیدی جائزہ، مکالمہ اور زندگی نامہ، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص:۲۸۹

۱۲۔ انتظار حسین، شہر زاد کے نام، ص:۱۱۱

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۷۴

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۷۳

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۹۳

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

حوالہ جات

۱۔ انتظار حسین، شہر زاد کے نام، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۲ء، ص:۹

۲۔ ایضاً، ص:۲۷

۳۔ نعیم انیس، ڈاکٹر، انتظار حسین: حیات و فن، کلکتہ: مغربی بنگال اردو اکیڈمی، ۲۰۱۷ء، ص:۳۶۰

۴۔ انتظار حسین، شہر زاد کے نام، ص:۲۸

۵۔ ایضاً، ص:۴۰

۶۔ ایضاً، ص:۴۴

۷۔ ایضاً، ص:۷۱

۸۔ ایضاً، ص:۹۸

۹۔ ایضاً، ص:۱۰۳

۱۰۔ ایضاً، ص:۹۷

۱۱۔ محمد عاصم بٹ، انتظار حسین تنقیدی جائزہ، مکالمہ اور زندگی نامہ، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص:۲۸۹

۱۲۔ انتظار حسین، شہر زاد کے نام، ص:۱۱۱

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۷۴

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۷۳

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۹۳